حکم و عبر

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

جسدِ ملّی کے ناسور

فکرِ ولی اللّٰہی کی روشنی میں

حضرت الامام الشاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے دیدہ ور اور صاحب نظر انسان تھے کہ ایسے انسان صدیوں میں ہی کبھی پیدا ہوتے ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ "دیدہ ور" جس وقت پیدا ہوا، اُس وقت برِّ عظیم کی عظیم مغل حکومت کھوکھلی ہو چکی تھی اور کہنا چاہیئے کہ اسے گھن لگ چکا تھا اور اس کا دم واپسیں تھا۔

شاہ صاحب حالات کے پیشِ نظر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وسیع تر حکمت کے پیشِ نظر حرمین شریفین چلے گئے جہاں انہیں حج بیت اللہ کی سعادت کے ساتھ ساتھ حرم مدنی میں حضور خاتم النبیین و المعصومین محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ والسلام کی مسجد اور گویا آپ کے "روبرو" بیٹھ کر آپ پر نازل ہونے والی کتابِ مقدس اور آپ کے فرمودات پر غور کرنے کا موقع ملا۔ جب حرمین شریفین کے گرامی قدر اساتذہ اور اصحابِ علم سے آپ نے کسبِ فیض بھی کیا۔

ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ یہ ہندی نوجوان ہم سے الفاظ لیتا ہے اور ہمیں معانی و مفاہیم سے نوازتا ہے۔ شاہ صاحب اُس وقت تک حرمین شریفین میں رہے جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اُس کے بعد اُن کی واپسی ہوئی ــــ نہیں بلکہ انہیں واپس کیا گیا۔

ایسا تاریخ میں بہت مرتبہ ہُوا کہ بعض افراد کو وہاں سے واپسی کا حکم ہُوا۔ مثلاً ماضی قریب میں بپا ہونے والی عظیم تبلیغی تحریک کے بانی حضرت الامام مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی مستقل قیام کے ارادہ سے وہاں گئے، لیکن بار بار انہیں خواب میں واپسی کا حکم ہُوا اور کہا گیا کہ تم سے کام لیا جائے گا۔

مولانا منحنی وجود کے فرد تھے، زبان صاف نہ تھی، گھبراہٹ کا شکار ہو گئے، لیکن اپنے علمی حلقہ کے ایک بزرگ مولانا سید احمد فیض آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ (برادر بزرگ حضرت شیخ الاسلام مولانا السید حسین احمد مدنی قدس سرہ و بانی مدرسۃ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ) کے سامنے جب یہ بات رکھی تو انہوں نے فرمایا کہ:

"میاں واپس جاؤ، تمہیں کہا جا رہا ہے کہ تم سے کام لیا جائے گا۔ یہ تھوڑا کہا جا رہا ہے کہ تم جا کر کام کرو۔ کام لینے والے خود لے لیں گے۔"

اسی طرح راولپنڈی کے گاؤں گولڑہ کے مشہور صاحبِ علم بزرگ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم و مغفور کی بھی ایسی ہی خواہش تھی۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ جب وہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت الشیخ الامیر امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز کی "بزم عرفان" وہاں قائم تھی۔

پیر صاحب اس کے بادہ نوشوں میں شامل ہو کر حاجی صاحب کے خدام کی فہرست میں آ گئے اور ان سے اپنے عندیہ کا ذکر کیا کہ وہ یہاں مستقل قیام کے متمنی ہیں۔

حاجی صاحب نے غور و فکر کے بعد انہیں واپسی کا فرمایا۔ اور فرمایا پنجاب میں ایک بڑا فتنہ رونما ہونے والا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تم سے کام لیں گے۔

پیر صاحب حضرت الشیخ کے حکم کی تعمیل میں واپس آ گئے اور پھر یہاں انہیں قادیانی نبی سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملا۔ علاوہ دوسری خدمات کے، انہوں نے سیدنا مسیح عیسیٰ علیہ سلام اللہ تعالیٰ علیہ وصلاتہ کے رفع و حیات پر ایک عظیم الشان کتاب سیف چشتیائی لکھی جو ہمارے مناظراتی لٹریچر میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ وہ ان سب کے بڑے تھے اور ان سے پہلے انہیں وہاں سے واپسی کا حکم ہوا۔

واپسی پر انہوں نے مختلف حوالوں سے کام کیا۔ اور یہ بات بلاخوف تردید کہی

© rasailojaraid.com

جا سکتی ہے کہ ان کی وفات کے بعد سے اب تک اس پورے خطہ میں" اصلاحِ احوال"
کی غرض سے جو تحریک بپا ہوئی، اس میں انہی کے انفاس طیبہ کی گرمی کارفرما تھی۔
اُن کے دور سے بالکل متصل تحریک اصلاح و جہاد " انہی کے فرزند گرامی حضرت
شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی میں شروع ہوئی ـــ شاہ عبدالعزیز ان رجالِ کار
میں سے تھے جن پر" استاذ الاساتذہ" کے لفظ کا صحیح معنوں میں اطلاق ہوتا ہے۔
تاریخ میں حضرت الامام ابو حنیفہ رح، علامہ ابن نجیم، شاہ عبدالعزیز رح اور مولانا
محمود حسن (شیخ الہند) بجا طور پر اس لقب کے مستحق ہیں کہ ہر ایک کی حسنِ تربیت
کے نتیجہ میں ایسی ایسی گرامی قدر شخصیتیں سامنے آئیں کہ ان میں سے ہر ایک آفتاب و
ماہتاب کی مانند تھی۔
شاہ عبدالعزیز رح اس تحریک اصلاح و جہاد کے سرپرست تھے تو امارت حضرت
الامام السید احمد شہید البریلوی قدس اللہ سرہ العزیز کی تھی جو ظاہری علوم کے حوالہ سے تو
زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ لیکن جناب طالوت کو "بسطۃ فی العلم والجسم"
کی نعمت سے نوازنے والے نے انہیں بھی ان حوالوں سے خوب خوب نوازا تھا۔ حتیٰ کہ
شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڈھانوی، مجاہد فی سبیل اللہ مولانا اسمٰعیل شہید اور علمائے
صادق پور سمیت لاتعداد اربابِ علم و بصیرت ان کے گھوڑے کی رکاب تھام کر ساتھ ساتھ
بھاگنا اپنی سعادت خیال کرتے اور ان کے اشارۂ ابرو کی تعمیل میں ہی اپنی عظمت کا
راز پاتے۔
آپ کی اقتدا میں اہلِ بصیرت کو نماز ادا کر کے جو" کیفیتِ حضوری" حاصل ہوتی،
اُس کا تو ذکر ہی کیا ـــ لوگ محسوس کرتے کہ صحیح نماز وہی ہے جو سید صاحب کی
اقتدار میں ادا ہوئی۔
اس تحریک کے بعد ۱۸۵۷ء کی اجتماعی تحریک کی پُشت پر جن علماء کے فتاویٰ
تھے اور جن علماء و مجاہدین کی محنت تھی، ان کی نسبت ولی اللہی ہر شک و شبہ سے بالاتر
ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جولانی ملی اور جو عزم و حوصلہ نصیب ہوا، وہ بھی
شاہ صاحب کے نفس کی گرمی ہی کے سبب۔
اس کے بعد حالات کا رُخ تبدیل ہوتا ہے اور بہتر مستقبل کی غرض سے میدانِ

دغا کے بجائے تعلیم وتعلّم کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو دیوبند کی تحریک علمی سے لے کر علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیّہ تک کی تحریکوں کے بانی اسی خانوادہ کے فیض یافتہ تھے اور ان کا سلسلۂ تلمذ و سند انہی بزرگوں سے وابستہ تھا۔

اور تاریخ کے قاضی کے اس فیصلہ کو چیلنج کرنا ممکن نہیں کہ انہی علمی تحاریک کی کاوشیں بالآخر حصولِ آزادی کا ذریعہ بنیں۔

تاہم یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد مسلمان قوم کا اجتماعی حال پتلا کیوں رہا اور اب تک برابر رو بہ تنزّل کیوں ہے؟ تو ہمارے خیال میں اس کے مختلف اسباب ہیں۔

الف: ایک سبب وہ رخنہ اندازی ہے جو جعلی اور جھوٹی نبوّت کے حوالہ سے غاصب انگریز نے پیدا کی۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے ملّت کا ایک طبقہ (جدید تعلیم یافتہ حضرات) اسلام کی بنیادی تعلیمات کے معاملہ میں ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے تو دوسرے طبقہ (قدیم تعلیم یافتہ حضرات) کو اس فتنہ کے دفاع میں اپنی بڑی صلاحیتیں صرف کرنا پڑیں۔ حتیٰ کہ حصولِ آزادی کے ۴۸ برس بعد بھی اس فتنہ کے برگ و بار پوری طرح ختم نہیں ہوئے

اس صورتِ حال کے نتیجہ میں بنیادی کام بُری طرح متاثر ہوئے اور اجتماعی انداز سے بہتر مستقبل کے لیے ہونے والی کاوشیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

ب: اُس دَور میں قادیانیت کے علاوہ بعض اور ایسے علمی فتنے رونما ہوئے جن کے دفاع کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جا سکی حتیٰ کہ جب انگریز کے چل چلاؤ کا وقت آیا تو وہ فتنے خاصا حلقہ بنا چکے تھے اور انہوں نے بھی ملّت کی اجتماعی سوچ کو اچھا خاصا دھچکا لگایا۔

اس ضمن میں سنّت کی تشریعی حیثیت کو چیلنج کرنے والے اربابِ علم کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے ایک طرح اس مسلّمہ حقیقت کو نظر انداز کیا تو دوسری طرف ایک خاص موقف پر ملّت کے سوادِ اعظم کا ترجمان بن کر ذہنی انارکی کی فضا پیدا کی۔

تقسیمِ ملک کے بعد سے اب تک دستوری اور آئینی میدان میں دینی حوالہ سے جو طبقہ ایک بڑی رکاوٹ کا باعث بنا ہُوا ہے وہ یہی طبقہ ہے، کیونکہ اس نے جیسا کہ عرض کیا، تحریکِ پاکستان کے دَور میں سوادِ اعظم کی ترجمانی کا فرض ہاتھ میں لے کر یہاں

© rasailojaraid.com

کی بوجوہ مؤثر قوتوں کو خاصا متاثر کیا ہے اور اس وجہ سے یہ رکاوٹ سدِ سکندری بن گئی ہے۔

ج : فرقہ واریت اور اس سے بڑھ کر تکفیرِ مسلمین کی بے ہودہ مہم نے غلامی کے زمانہ میں خاصے بال و پر نکالے اور تقسیمِ ملک کے بعد دھیرے دھیرے اس کے اثرات بڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ اب اس نے ایک عفریت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دھرتی پر جو گناہ ہوتے ہیں ان میں ایک بہت ہی زیادہ زہریلا گناہ "تکفیرِ مسلمین" ہے ـــ حضور اقدس محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وسلامہ نے اس کے بُرے انجام سے اس طرح متنبّہ کیا کہ:

"جو شخص کسی کو کافر کہتا یا اس پر لعنت بھیجتا ہے اور اگلا اس کا مستحق نہیں تو اس کا وبال کہنے والے کی گردن پر ہوگا۔"

لیکن یہاں تو افراد سے بڑھ کر جماعت بلکہ پوری اُمّت کو اس ناوک افگنی کا شکار ہونا پڑا۔ انگریز، دورِ اقتدار میں اس کو ضرورت تھی کہ اس کا ظالمانہ اقتدار ہمیشہ قائم رہے۔ اس مقصد کی غرض سے اُس نے جہاں "نبوّتِ کاذبہ" کا سہارا لیا وہاں ایسے "شمس العلماء، اعلیٰ حضرت، علّامہ اور سجّادگان طریقت" بھی ڈھونڈ نکالے جو اس ظالم کو حق بجانب ثابت کریں، اس کے دور کو امن کا دور قرار دیں، اُس دور کے ہندوستان کو دارالاسلام ثابت کریں، اس کے دورِ حکومت کے دوام و استحکام کے لیے دعائیں مانگیں۔ اور جہاد و تعلیم کے میدان میں اس سے مقابلہ کرنے والے "مردانِ راہِ حق" کو بدعقیدہ ثابت کر کے انہیں کفر و نفاق کے زہر آلود خنجروں سے زخمی کریں اور اس طرح سادہ لوح عوام کو ان کی پشت پر کھڑا ہو کر مقابلہ کرنے کی راہ سے روکیں ـــ گویا صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ـــ کا کردار ادا کریں۔

دورِ غلامی میں "غلامانِ تقیہ" اور "آلِ ابنِ سبا" کا بھی ایک رول تھا ـــ مغل ایمپائر، سراج الدولہ، اور سلطان ٹیپو کے خلاف اس طبقہ کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں تاریخ کا ایک المناک باب ہے ـ اس المناک باب پر تفصیلی گفتگو اللہ نے چاہا تو ہم آئندہ کسی وقت عرض کریں گے، اس وقت صرف اس طرف توجّہ دلانا مقصود ہے کہ اُس دَ... میں اس طبقہ کے معتقدات اور تاریخی طرزِ عمل سے آنکھیں بند کر کے بعض دوائر میں اس کو

aid.com

اپنی مجالس میں شامل رکھا گیا۔ حتیٰ کہ یہاں تک المیہ رونما ہُوا کہ مسلم سیاسیات کے بعض انتہائی نازک اور حساس معاملات اس طبقہ کے افراد کے ہاتھ چلے گئے اور تقسیم ملک کے بعد اِسی طبقہ کے ایک انتہائی اہم فرد، جس کا تعلق ضلع جہلم سے تھا اور جو سفارت سے لے کر مرکزی وزارت تک کے مزے لُوٹ رہا تھا، نے ایک موقع پر یہ بڑ ہانک دی کہ اب اس ملک میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا قرآن کوئی نہ سُننے گا۔ اس پر مرحوم بخاری صاحب نے برجستہ کہا ؎

تبرائیو! اب تبرا کرو — کہ اب وقتِ قرآن خوانی گیا
کرو کو بکو یا علی یا علی — کہ اب ذکرِ اوّل و ثانی گیا

اب وہی طبقہ ہے جو ان مخصوص حالات اور پھر ایرانی انقلاب کے سبب آنکھیں دکھا رہا ہے اور حکومت سے لے کر مذہبی قیادت کی اکثریت خوشامدانہ رول ادا کر کے دینی غیرت کا جنازہ نکال رہی ہے۔

انہی عوامل نے مِل جُل کر حالات کی تصویر بگاڑی اور حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی جانشین مولانا محمد الیاس رحمہما اللہ تعالیٰ کے بقول:

"امت کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور اس قوم کے افراد کے اُمت بننے میں رکاوٹ پیدا کی یہ تمام طبقات صرف اس لیے سرگرم عمل تھے کہ یہاں انگریز کا اقتدار مستحکم رہے اور ایسی عادلانہ حکومت قائم نہ ہو سکے جس کے پیش نظر بڑے چھوٹے کے مفادات یکساں ہوں اور کوئی کسی پہ ظلم نہ کر سکے۔

اِس خدمت کے صلہ اور نتیجہ میں ان لوگوں کو خطابات سے نوازا گیا۔ مربعے الاٹ ہوئے۔ دربار میں کرسی میسر آئی۔ لیکن تا کجے!

انگریز کے ظالمانہ اقتدار کو کوئی چیز سہارا نہ دے سکی — اس کی کشتی ڈوبی اور اس طرح کہ جس کے اقتدار کے متعلق کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ اُس کے حدودِ مملکت میں سورج نہیں ڈوبتا، اب وہ ایک جزیرے میں بند ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ اس کے "یاران سر پل" اپنی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور لن ترانیوں کے ساتھ اب تک زندہ و پائندہ ہیں۔

اس افسوسناک صورتِ حال کا سبب کچھ ایسا ہے کہ "سفید صاحب" نے جاتے ہوئے اقتدار کے سر چشمے "کالے صاحب" کے سپرد کرنے میں عافیت سمجھی تا کہ جن لوگوں کی پیہم قربانیوں

© rasailojaraid.com

کے نتیجہ میں سونے کی چڑیا اُس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے، وہ پھر بھی محروم رہیں گے! اُس نے جاتے جاتے بھی بلا نوشان محبت سے انتقام لیا اور اپنے پیاروں کو نواز کر چلتا بنا۔

جب سفید صاحب کی تربیت یافتہ نسل برسرِ اقتدار آئی تو اس نے اپنے آقایانِ ولی نعمت کی مرتبہ فائلیں نکال کر اقتدار کے استحکام و دوام کے نسخے تلاش کیے تو بات اُس کی سمجھ میں آ گئی اور اُس نے

الف : جھوٹے نبوت کے پرچارکوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا حتیٰ کہ اہم کلیدی پوسٹیں انہیں دے دیں۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے پہلے دن سے جنگی محاذ گرم رہا تاہم ۱۹۷۴ء میں ایک مرحلہ سر ہوا اور وہ بھی بعض اس حد تک کہ انہیں کتاب دستور میں جسدِ ملت سے الگ کر دیا گیا۔ رہ گئے باقی معاملات تو ان کا حال جوں کا توں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسی طرح جسدِ ملت کو جونک بن کر چمٹے ہوئے ہیں۔

اِس محاذ پر ہوش، تدبّر اور خلوص سے کام کرنے والوں کا قافلہ لٹ گیا اور راہیٔ ملکِ بقا ہو گیا۔ اب ایک طرف حکمران ہیں جن کا خلوص سے دُور کا واسطہ نہیں تو دوسری طرف ان عظیم لوگوں کے "وارث" ہیں، جو اہلیت کی بنا پر کم اور دوسرے ذرائع سے زیادہ وارث بنے ہیں —— خلوص کی تلاش مشکل، وہ اگر ہے تو ہوش و تدبّر ندارد، نتیجہ یہ ہے کہ پتے جھاڑنے اور ٹہنیوں کی اصلاح کی تو سب کو فکر ہے، اِس سے آگے کچھ نہیں۔

ہونا یہ چاہیئے تھا کہ مرزائی نبوت اور مرزا کے خاندان کے مادی وسائل پر کاری ضرب لگائی جاتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں۔ افسوس کہ آج چودھری افضل حق سے لے کر مولانا تاج محمود تک ایک ایسا نہیں جو ربوہ کے معاشی وسائل پر ایک خاندان اور اس کے لگے بندھوں کے مفادات کے خلاف آواز اُٹھائے۔

اگر غیر مسلم اوقاف میں یہاں کے وسائل شامل کر لیے جائیں اور ربوہ کی شہری جائیداد وہاں موجود آبادی کے سپرد کر دی جائے تو یہ فتنہ دم توڑ کر رہ جائے گا۔ لیکن اس کا شعور کیسے ہو؟ بدقسمتی سے ہمارے یہاں غریب عوام کے مذہبی جذبات سے کھیل کر اقتدار و سیاست کی دکان چمکانے کا رواج پڑ چکا ہے، اسی عافیت کے راستے کو مذہبی قیادت نے اپنا لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل مسائل کا احساس نہیں۔

ب : سنت کی تشریعی حیثیت کا انکار کرنے کے باوصف جو لوگ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے سوادِ اعظم کی صفوں میں گھسے انہیں نکال باہر کیا جاتا اور انہیں ع ایاز قدرِ خود بشناس

کی نصیحت کی جاتی ۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اہلِ اقتدار سے لے کر اہلِ سیاست تک، سبھی نے محسوس کر لیا ہے کہ عافیت اسی میں ہے کہ سنت کی تشریعی حیثیت متنازعہ فیہ بنی رہی تاکہ اس طرح ہمارے الٹے تلٹے چلتے رہیں ۔

حیرت ہے کہ ایک عرصہ سے یہاں "لا الٰہ الّا اللّٰہ" کی رٹ بہت لگتی ہے لیکن "محمد رسول اللّٰہ" کی بات بہت کم کی جاتی ہے ۔

جب اللہ تعالےٰ نے اپنے ساتھ اپنے محبوب کریم کا تذکرہ ہر جگہ رکھا تو ہمارے یہاں یہ سوانگ کیوں رچایا گیا کہ آدھے کلمہ پر اکتفا کر لیا گیا؟

شاید اس میں یہی راز ہے کہ نہ محمد کریم اور ان کی سنت کی بات ہوگی نہ ہی قرآن کی تشریح و ترجمانی کا مرحلہ آئے گا ۔ اور اس طرح اسلام کی خدمت کے جھوٹے دعوؤں کے باوصف عملاً کچھ نہ ہو سکے گا ۔

اے کاش! لوگوں کو خیال ہوتا کہ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خوارج سے گفتگو کرنے کی غرض سے "حبر الامۃ"، "ترجمان القرآن" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بھیجا تو اس سے منع فرمایا کہ قرآن کو درمیان میں نہ لانا ۔

ج : فرقہ واریت کے عفریت کا سر کچلنے کے بجائے اسے بھی مزید بالا کیا گیا کہ اس میں ہے — لڑاؤ اور حکومت کرو — کا راز اسی میں ہے، بلکہ اب تو ستم یہ ہوا کہ جو لوگ انگریز کے اقتدار کے دور کے ہندوستان کو دارالاسلام کہتے، انہیں یہاں بھی پذیرائی حاصل ہوئی اور ہر جماعت و فرد پر فتوائے کفر لگانے والے اب مسلمانوں کے سب سے بڑے خادم قرار پائے اور جو شخص اس فتوے کا بانی تھا اسے یہاں کے پریس اور ذرائع ابلاغ نے "امامت" کے منصب پر فائز کر دیا ۔ معلوم نہیں کہ یہ حقائق کی کون سی قسم ہے اور اس کو کس کی خدمت قرار دیا جا رہا ہے؟

د : یہی "غلامانِ نفقیہ" کا ہے کہ ان کی ہر غلط ادا کو بھی برداشت کیا جا رہا ہے اور ان کی فتنہ سامانیوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں ۔ ان کے معتقدات، تاریخی کردار اتنا واضح ہے کہ کسی رعایت کی گنجائش نہیں اور خود وطن عزیز میں ان کے ہاتھوں جو ہوا وہ سب سے بڑھ کر ان کی فسادی ذہنیت کا ثبوت ہے لیکن فیاحسرتا کہ پھر ان کی خوشامد!

سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح ہم سنبھل سکیں گے؟ ہمارے ادبار و تنزل کی رات ختم ہو جائے گی؟ معاشرے کو امن نصیب ہو جائے گا اور انسانیت کے دکھ دور ہو جائیں گے؟

© rasailojaraid.com

ہمارا ایک ہی جواب ہے کہ نہیں اور بالکل نہیں۔

بلکہ اصلاحِ احوال کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ اس مفکر و دانشور کی فکر میں غوطہ زن ہو کر ہوش و تدبر سے عمل کی راہیں استوار کی جائیں، جس کا ہم نے ابتداء میں ذکر کیا۔

اس کے قلم سے نکلے ہوئے ہزاروں صفحات میں سے ہر صفحہ بحمد اللہ محفوظ ہے، پاک و ہند سے لے کے مصر و حجاز تک ان کی اشاعت ہو رہی ہے، ان پر حواشی لکھے جا رہے ہیں۔ ان کی تشریحات میں کاغذ ہور ہو رہے ہیں۔ اور ان کے مختلف زبانوں میں تراجم ہو رہے ہیں لیکن یہ تو صرف ان دانشوروں کی شوخیاں ہیں جو "لغت ہائے حجازی و غیر حجازی" کے "قارون" ہیں جنہیں لکھنا پڑھنا سب آتا ہے لیکن جو عمل کی قوت سے عاری ہیں۔

ایسے "قارون"، شوخیٔ گفتار کے امام ہوتے ہیں لیکن عمل کے میدان کے کھوٹے —

جب کہ بقول مولانا ابو الکلام آزاد

"میرے بھائی اپنی تمام صلاحیتیں علم پر ہی نہ خرچ کریں کچھ حصہ عمل کو بھی دیں۔"

عمل کے لیے امام ولی اللہؒ کی معرکۃ الآرا کتاب "تفہیماتِ الٰہیہ" کے جزوِ اوّل کی تفہیم ۶۶ کافی ہے — اس میں امام موصوف نے "اخلاقی زوال" پر بعض طبقات کے حوالہ سے بڑی خوبصورت گفتگو کی ہے اور بتلایا ہے کہ کس طرح مختلف طبقات اپنی غلط روی سے ملت کے زوال کا باعث بن رہے ہیں۔

انہوں نے اسلام کے دامنِ اتحاد کو تار تار کرنے والی فتنوں میں سب سے پہلے شیعہ و روافض کا شمار کیا اور پھر اس میں ہر اُس طبقہ کو شامل کیا جو نئے علم کلام کا مدعی بن کر سامنے آتا ہے — ان کے اس تجزیہ کو سامنے رکھ کر سوچیں کہ آج کی جھوٹی نبوت اور سنت کی تشریعی حیثیت کے منکر کیا نئے علم کلام کے دعوے دار نہیں اور باقی دو طبقات جن کا ہم نے ذکر کیا وہ ملت میں تفریق و انتشار کے مجرم نہیں؟

اگر یہ دونوں باتیں صحیح ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ اس جدت پسندی اور ذوقِ تفریق کو ٹھکانے لگانے کی کیا سبیل ہوئی؟

شاہ صاحب کا تجزیہ ہے کہ یہ چیزیں یعنی جدت پسندی اور انتشار و تفریق زوال پذیر قوموں کے من پسند اور محبوب مشغلے ہوتے ہیں۔ وہ آئے دن نئے شگوفے چھوڑنے میں ماہر ہوتی ہیں اور انتشار و تفریق سے انہیں گہری مناسبت حاصل ہوتی ہے۔ اور بقول

id.com